بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

اشارات

اشتراکیت کا بنیادی فلسفہ اگرچہ تاریخ کی مادی تعبیر ہی ہے لیکن زندگی کے مختلف دائروں میں اس کے علمبرداروں نے ہر دائرے کے عملی مضمرات کو سامنے رکھتے ہوئے اس فلسفہ کی مختلف توجیہات پیش کی ہیں۔ جس فلسفے کو تاریخ کی مادی تعبیر کہا جاتا ہے اس کی فکری توجیہ یہ ہے کہ اس کائنات میں اصل اہمیت مادہ کو حاصل ہے اور باقی جو کچھ موجود ہے وہ اس مادے کی کرشمہ سازی ہے۔ اور یہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ قوانین طبعی کے تحت ہو رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ انسان کا مادی ماحول اس کے اعمال و افکار کی صورت گری کرتا ہے اور انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پوری طرح اس کی تابع ہوتی ہے۔ اس فلسفے کی عملی توجیہ یہ ہے کہ انسان اس کارخانۂ حیات میں ایک عارضی اور اتفاقی شے ہے جو فطرت کی اندھی قوتوں کی نہ صرف تخلیق بلکہ اُن کے ہاتھ میں بے بس کھلونا بھی ہے۔ اس مادی دنیا میں چونکہ سب سے زیادہ اہمیت ذرائع پیداوار کو حاصل ہے جو ہر وقت تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے انسان کی اخلاقی اور روحانی اقدار میں بھی ہر وقت تغیر برپا ہوتا رہتا ہے۔ یہاں کوئی چیز بھی کسی مستقل قدر و قیمت کی حامل نہیں ہو سکتی۔

اگر اس فلسفے کی فنی پیچیدگیوں سے ہٹ کر اس پر غور کیا جائے تو انسان اسے تین اجزاء کا مرکب پاتا ہے۔

(۱) انسانی تہذیب و تمدن میں خارجی قوتوں اور خصوصاً پیداواری قوتوں کی فیصلہ کُن اہمیت۔

(۲) ماضی کی ہر چیز سے بیزاری اور نفرت اور اسے بیکار اور غلط سمجھنے کا جذبہ۔

(۳) تعاون و اشتراک کی جگہ شدید نوعیت کی آویزش اور کشمکش۔

جس معاشرے میں بھی اشتراکی نظریات پرورش پانا شروع کرتے ہیں وہاں انکارِ خدا اور مذہب سے انحراف اور اخلاقی حدود و قیود کو بڑی ڈھٹائی کے ساتھ پامال کرنے کے رجحانات کے ساتھ ساتھ زندگی کے

ہر میدان میں طبقاتی کشمکش بھی پوری قوت کے ساتھ سر اٹھاتی ہے اور پورے معاشرے کو تہ و بالا کر کے رکھ دیتی ہے۔ اشتراکی فلسفے میں چونکہ زبردست تضاد پایا جاتا ہے اس لیے اس تضاد کے اثرات ہمیں زندگی کے ہر شعبے میں مختلف صورتوں میں ملتے ہیں لیکن ایک چیز جو ہر جگہ نمایاں نظر آتی ہے وہ ہے بغاوت۔ انسان کی انفرادی زندگی میں اس کے شخصی حقوق کے خلاف بغاوت، مذہبی اقدار اور اداروں کے خلاف بغاوت۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس بغاوت کے انداز ہر جگہ ایک جیسے نہیں ہوتے۔ کہیں یہ استحصال کے خلاف جد و جہد کی شکل میں نمودار ہوتی ہے کہیں یہ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے خلاف مزدوروں اور کسانوں کے حقوق کے تحفظ کی صورت اختیار کرتی ہے، کہیں مذہبی بندھنوں کے خلاف انسانی ضمیر کی آزادی کا روپ دھار لیتی ہے۔ ان صفحات میں اتنی گنجائش نہیں کہ ہر شعبۂ حیات میں اس کے اثرات کی نشاندہی کی جائے۔ یہاں ہم معاشرے کی زندگی کے صرف ایک گوشے میں اس کے چند مظاہر کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

معاشرتی زندگی کی تشکیل، اس کے مختلف شعبوں کے مابین ربط و ضبط، اس کے ارتقا اور ترقی کا مدار اس بات پر ہے کہ کسی معاشرے کو کوئی ایسی فکری اساس میسر آجائے جو نہ صرف اس کے مختلف اجزاء کو ایک دوسرے سے جوڑ کر اسے ایک اجتماعی شکل دے دے بلکہ اس کے افراد کے اندر ایک ایسی امنگ بھی پیدا کرے جس کی بنا پر وہ اپنی قوتوں کو تعمیر و ترقی کی راہ پر لگانے کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ جس معاشرے میں فکری ہم آہنگی پیدا نہیں ہوتی اور عمل کی سمت متعین نہیں ہوتی وہ معاشرہ کبھی بھی عزت و وقار کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس لیے ہر ترقی پذیر معاشرہ اختلاف و افتراق کے جذبات ابھارنے کے بجائے تعاون و اشتراک کے احساسات کی آبیاری کرتا ہے تاکہ وہ فکر و عمل کے اعتبار سے جسدِ واحد بن جائے۔

اس امر کا اہتمام یوں تو دنیا کے ہر زندہ معاشرے نے کیا ہے کیونکہ اس کے بغیر اس کی بقا ممکن نہیں ہوتی لیکن اسلام نے خاص طور پر اس فکری و عملی وحدت کی طرف توجہ دی ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ جس معاشرے کے پاس اتحاد کی صرف نظریاتی بنیاد ہی ہو اس کے افراد کے اندر اگر نصب العین سے شدید محبت پیدا نہ ہونے پائے اور اس محبت کی وجہ سے وہ دوسرے نظریات کا پوری جرأت اور قوت کے ساتھ چیلنج قبول کرنے کا عزم نہ رکھتے ہوں تو ایسا معاشرہ کوئی زندہ معاشرہ نہیں کہلا سکتا بلکہ راکھ کا ایک ڈھیر ہوتا ہے جسے

مخالف افکار کی آندھیاں جس طرف جاتی ہیں بآسانی اڑا کر لے جاتی ہیں۔ اسلام کے دشمنوں کو اسلامی معاشرے کے اس مزاج کا بخوبی اندازہ ہے اور انہیں اس بات کا بھی علم ہے کہ اس کی فکری اور جذباتی اساس کو نقصان پہنچا کر اس کی وحدت کو پارہ پارہ کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ان اعدائے اسلام نے جہاں افکار و نظریات کی دنیا میں اسلام کے خلاف مختلف قسم کی بدگمانیاں پھیلانے کا التزام کر رکھا ہے وہاں سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی میں بھی تشتت و افتراق کی کئی راہیں نکالی ہیں۔ جن میں سے ایک راہ کو بلا تردد آج کل کی نفسیاتی اصطلاح میں خلائے نسل (GENERATION GAP) کہا جا سکتا ہے۔ اس اصطلاح کا سادہ سا مفہوم یہ بیان کیا جاتا ہے کہ پرانی نسل اور نئی نسل کے درمیان ایک خلا موجود ہے جسے پر کیے بغیر ہماری قوم ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتی۔ مگر یہ اصطلاح کا صرف لغوی مفہوم ہے، اس اصطلاح کے عملی مضمرات کی نوعیت معاشرتی زندگی میں بالکل وہی ہے جو معاشی زندگی میں طبقاتی نزاع کی ہے۔ اشتراکی فلسفۂ حیات جس طرح معاشی دائرے میں ایک طبقے کو دوسرے کا دشمن بلکہ خون کا پیاسا قرار دے کر انہیں ایک دوسرے کے خلاف بھڑکاتا ہے ٹھیک اسی طرح خلائے نسل کا نظریہ ہر نئی نسل کے ذہن میں یہ باطل خیال راسخ کرتا ہے کہ پرانی نسل نے اس کا ہر لحاظ سے استحصال کیا ہے۔ اپنا تفوق قائم کرنے کے لیے اسے ایسے نظریات دیئے ہیں جن سے نئی نسل کے دل پر پرانی نسل کی برتری کا نقش ثبت ہو۔ اس باطل خیال کی ترویج اب نئی نسل کا دلپسند مشغلہ بن کر رہ گیا ہے۔ آپ ریڈیو اور ٹیلیویژن کے پروگراموں کو سنیں تو آپ یوں محسوس کریں گے کہ نئی نسل میں انتقام کی آگ پوری شدت سے بھڑک رہی ہے اور وہ ہر اس نقش کو مٹانے کے درپے ہے جسے کسی طرح بھی "نقشِ کہن" کہا جا سکتا ہے۔ نئی نسل کے دل میں پرانی نسل کے بارے میں جذبۂ احترام بیدار کرنے کے بجائے جذبۂ نفرت ابھارا جا رہا ہے اور اسے یہ تاثر دیا جا رہا ہے کہ ہماری پرانی نسل عقل و شعور کی صلاحیتوں سے یکسر عاری ہے، اس نے تعمیر و ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کے بجائے سطحی جذباتیت کے ساتھ زندگی گزارنے کی کوشش کی، اس نے سائنسی حقائق سے منہ موڑ کر مذہب کی پھیلائی ہوئی خوش فہمیوں میں اپنے آپ کو گرفتار کرنا پسند کیا، اس نے عقل کی ترقی کے راستے مسدود کر دیے، تہذیب و تمدن کو پروان چڑھنے سے روکا۔ الغرض جو ظلم انسانیت کا کوئی بدخواہ کسی دوسرے بے بس گروہ کے ساتھ کر سکتا ہے وہ پرانی نسل نے نئی نسل کے ساتھ روا رکھا لیکن اس کے باوجود وہ نوخیز نسل سے اس بات کا مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اس کا احترام کرے۔ اس سے بڑا احمقانہ مطالبہ اس دنیا میں اور کیا ہو سکتا ہے؟

پُرانی نسل کے خلاف نئی نسل کا جذبۂ نفرت و حقارت مادی تہذیب کا خاصہ ہے لیکن اس کے جو مظاہر ہمارے ملک کے اندر دیکھنے میں آرہے ہیں وہ نہایت خطرناک رجحانات کا پتہ دیتے ہیں۔ اگر نئی نسل اپنے بڑوں کی خامیوں کو سامنے رکھ کر اصلاحِ احوال کے لیے کوشاں ہوتی تو ایک آدمی یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوتا کہ چلیے ماضی سے بغاوت ہی سہی مگر کسی حد تک تعمیر کا کام تو شروع ہؤا ہے لیکن یہاں کسی تعمیری کام کے بجائے پرانی نسل کی تذلیل کے مشغلے میں ساری قوتیں کھپائی جا رہی ہیں کبھی کسی پُرانی وضع کے ادیب کو ٹیلیویژن کے پردہ پر لا کر اسے اس طرح کے اُلٹے سیدھے سوال پوچھے جاتے ہیں جن سے اُس کا استخفاف ہوتا ہے، کبھی کسی نیک دل شاعر کی مٹی پلید کی جاتی ہے، کسی عالمِ دین کی بزرگی اور فضیلت کا مذاق اُڑایا جاتا ہے۔ پُرانی نسل کے ساتھ اس غیر انسانی سلوک کو محض نئی نسل کی شوخیٔ طبع پر محمول کر کے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا یہ سب کچھ ایک بگے بندھے منصوبے کے مطابق اور گہری سازش کے تحت کیا جا رہا ہے۔ اس کا مقصد چند افراد کی تضحیک نہیں بلکہ اُن اقدار کی تذلیل ہے جن کا کہ ان حضرات کو ترجمان سمجھ کر مذاق اُڑایا جاتا ہے۔

اسلام نے جس طرح جغرافیائی حدود سے بالاتر ہو کر پُوری انسانیت کو ایک رشتۂ اخوت میں جوڑا ہے بالکل اسی طرح اس نے زمانی حد بندیوں سے ماوراء ہو کر پُوری انسانیت کو ایک وسیع برادری کی حیثیت سے اس کے ساتھ معاملہ کیا ہے۔ اسلام کی نظر میں قصۂ جدید و قدیم دلیلِ کم نظری ہے کیونکہ انسان کے اندر عقل و شعور اور جذبہ و احساس کے اعتبار سے کوئی فرق واقع نہیں ہؤا۔ جو چیز آج سے چار ہزار سال پہلے حق تھی وہی آج بھی حق ہے۔ اور جو اِس وقت باطل تھی وہی آج بھی باطل ہے۔ اگر دیانت و امانت اس وقت پسندیدہ صفات تھیں تو آج بھی اُنہیں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اگر نوعِ بشری کے بارے میں یہ فرض کر لیا جائے کہ ہر دَور کا انسان دوسرے انسان سے مختلف ہے تو پھر کوئی نظریہ یا کوئی اصول یا کوئی اخلاقی پیمانہ کسی مستقل قدر و قیمت کا حامل نہیں رہتا۔ کیونکہ ایک مخصوص عہد کے گذر جانے کے بعد وہ بیکار ہو جاتا ہے۔ اس کی افادیت تو صرف ایک خاص عہد تک محدود ہوتی ہے انسانیت کو جب تک زمان و مکان سے ماوراء ایک فطری اکائی نہ تسلیم کیا جائے اس وقت تک کسی سچائی کو عالمگیر نہیں مانا جا سکتا۔ اور اس طرح کسی دین کے بارے میں بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی تعلیمات قیامت تک

صحیح اور حق ہیں۔

جو تصور بھی نسلِ انسانی کی اس فطری وحدت کو پاش پاش کرتا ہے وہ درحقیقت ان ابدی سچائیوں کو جھٹلاتا ہے جن کے تسلیم کرنے کی وجہ سے انسانیت کی آنکھوں سے امروز و فردا کے حجابات اُٹھ جاتے ہیں اور ہر فرد اپنے آپ کو انسانی برادری کا رکن سمجھتے ہوئے نوعِ بشری کے وسیع تر مفاد کے نقطۂ نظر سے سوچتا اور کام کرتا ہے۔ اس کے افکار و نظریات میں آفاقیت کا رنگ غالب ہوتا ہے اور اس کے جذبات و احساسات میں اتنی وسعت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ الہامی تعلیمات کو انسانیت کا مشترک سرمایہ سمجھتے ہوئے اُسے سینے سے لگاتا ہے۔ مغرب کی جارحانہ قوم پرستی نے اگر انسانوں کو رنگ، نسل، زبان اور مکان کے امتیازات کی وجہ سے ایک دوسرے کا دشمن بنایا ہے تو خلائے نسل کے نظریئے نے ایک نسل کو دوسری کا حریف بنا دیا ہے۔ یورپ میں جب نیشنلزم کو فروغ ہوا تو لوگ اس نظریے کے تباہ کن نتائج کی اچھی طرح پیش بینی نہ کر سکے۔ اُنھوں نے اسے یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا کہ آخر جب انسانوں کے مختلف گروہوں کے مابین رنگ و نسل کے امتیازات موجود ہیں تو اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کیا حرج ہے لیکن جلد ہی ان امتیازات نے تعصبات کی صورت اختیار کر لی اور ان تعصبات کی بنیاد پر قوموں کی شیرازہ بندی ہونے لگی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر قوم نے دوسری اقوام کو اپنا دشمن سمجھتے ہوئے اس سے معاملہ کرنے کی کوشش کی اور اس طرح پورا کرۂ ارض منافرت اور جنگ و جدال کی تباہ کاریوں کی لپیٹ میں آ گیا۔

مغرب کی جارحانہ قوم پرستی نے تو ایک عہد کی قوموں کو ایک دوسرے کا حریف بنایا لیکن خلائے نسل کے نظریے نے نہ صرف ایک قوم کے اندر افتراق کے بیج بوئے بلکہ پوری انسانیت کے خلاف نئی نسل کو آمادۂ بغاوت کیا اور اسے یہ تاثر دیا کہ آج تک جتنی نسلیں بھی گذری ہیں ان میں سے ہر پرانی نسل نے نئی نسل کے لیے اخلاق و شرافت کا کوئی قابلِ قدر ترکہ چھوڑنے کے بجائے الجھنوں کا ایک وسیع جال چھوڑا تاکہ اس کی قوتوں اور صلاحیتوں کا زیاں ہوتا رہے۔ اس لیے نئی نسلیں اگر بہتر اور شاد کام زندگی کی متمنی ہیں تو ان کے لیے صحیح راستہ یہ ہے کہ وہ پرانی نسلوں کی ریشہ دوانیوں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ان تمام افکار و نظریات اور اخلاقی اقدار سے یکسر بغاوت کریں جن کی بنیاد پر پرانی نسلوں نے تہذیب و تمدن

کی عمارت اٹھائی ہوئی تھی۔ پرانی نسلوں نے افکار و تصورات اور مذہبی معتقدات کے جو گورکھ دھندے تیار کر رکھے تھے ان کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہ تھا کہ آنیوالی نسلوں کو دھوکے دیئے جائیں۔ پرانی نسلوں کی تعمیر کردہ تہذیب و تمدن کی عمارت کی حیثیت طلسم ہوشربا کی سی ہے جن کے اندر داخل ہوتے ہی انسان حقائق سے دُور ہو جاتا ہے۔ اس بنا پر نئی نسلوں کی بہتری اس میں ہے کہ وہ مذہبی افکار و معتقدات کے ان گورکھ دھندوں سے جلد از جلد نجات حاصل کریں اور تہذیب و تمدن کی اس پوری عمارت کو ڈھا دیں جس میں رہنے کی وجہ سے وہ حقائق کی روشنی سے محروم ہوتی ہیں۔

تاریخ کی مادّی تعبیر اور مغربی قوم پرستی کے نظریات میں اگرچہ ایک معنوی ربط موجود ہے مگر ان کے اثرات کسی حد تک الگ الگ اور جداگانہ ہیں۔ مثلاً تاریخ کی مادّی تعبیر سے ابدی اور آفاقی افکار کا پورا نظام اپنی جگہ سے ہل جاتا ہے اور انسان اس غلط فہمی کا شکار ہوتا ہے کہ دنیا میں کوئی سچائی بھی ابدی نوعیت کی نہیں بلکہ وقت کے گزرنے کے ساتھ وہ از کار رفتہ ہو کر باطل کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس طرح ہر دَور میں جو چیز بھی مادی اعتبار سے سب سے زیادہ مفید اور کار آمد ہے وہی حق ہے اور باقی سراسر باطل۔ تاریخ کی مادی تعبیر نے آفاقی قدروں کو جس قدر نقصان پہنچایا ہے کسی دوسرے فلسفۂ حیات نے نہیں پہنچایا۔ اس کے علاوہ اس نظریے نے معاشرے کے مختلف طبقوں کو بھی ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کیا ہے۔

مغرب کی جارحانہ قوم پرستی کی بنیاد اگرچہ حقارت و نفرت ہی ہے مگر اس کا دائرہ قدرے مختلف ہے۔ اس نظریے کو اپنانے کے بعد ایک قوم کے دل میں تو بلاشبہ دوسری اقوام کے خلاف شدید نفرت کے جذبات بھڑک اٹھتے ہیں اور وہ انہیں صفحۂ ہستی سے مٹانے کے منصوبے بنانے لگتی ہے، لیکن قوم کے اپنے افراد میں باہمی محبت اور تعاون کا جذبہ پوری طرح موجود رہتا ہے۔ اور اس جذبے کو قومی روایات کا وجود غیر معمولی تقویت پہنچاتا ہے۔ جو قومیں مغربی نیشنلزم کے جذبے سے سرشار ہوتی ہیں اُن کے دل میں ماضی کا بیحد احترام پایا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ ماضی سے نفرت کرنے لگیں تو اُن کا قومی شعور زندہ نہیں رہ سکتا۔ ان قوموں کو نہ صرف اپنے ماضی سے والہانہ عقیدت و محبت ہوتی ہے بلکہ وہ اسے اپنے

لیے سرمایۂ صد افتخار بھی سمجھتی ہیں اور ماضی کی اِن روایات کی بنا پر وہ دنیا میں سر اونچا کر کے چلتی ہیں۔ جارحانہ قوم پرستی کا تصور ایک قوم کو دوسری اقوام سے یقیناً الگ اور جدا کرتا ہے لیکن اس سے قوم کے اندر غیر معمولی اتحاد اور تعاون کی آبیاری بھی ہوتی ہے اور اتحاد کی یہ روح صرف ایک نسل کے اندر ہی جاری وساری نظر نہیں آتی بلکہ یُوں محسوس ہوتا ہے کہ یہی روح پُرانی نسلوں میں بھی پُوری قوت کے ساتھ کار فرما تھی اور اسی رُوح کی وجہ سے موجودہ نسل پرانی اَقدار کی امین بن کر دنیا میں جدوجہد کر رہی ہے۔ جارحانہ قوم پرستی نے ایک قوم کے تاریخی تسلسل کو توڑنے کے بجائے اس کے تحفظ میں مدد دی ہے چنانچہ جن قوموں نے اس تصور کو اپنایا ہے ان کے ہاں ماضی کے افکار و نظریات کے خلاف بغاوت کے بہت کم رجحانات ملتے ہیں بلکہ ماضی کی روایات کو ایک بیش قیمت ورثہ سمجھتے ہوئے اس سے بھرپور فائدہ اٹھانے کا جذبہ پایا جاتا ہے۔

خلائے نسل کا نظریۂ تاریخ کی مادی تعبیر اور مغرب کی جارحانہ قوم پرستی دونوں کی برائیوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اس سے ماضی اور اس کے بطن میں پرورش پانے والے افکار و معتقدات کے خلاف نفرت کا شدید رجحان ابھرتا ہے اور نئی نسلیں اس زعمِ باطل میں مبتلا ہو جاتی ہیں کہ ہر وہ نظریہ یا شئے جس کا تعلق ماضی سے ہو وہ لازمی طور پر غلط اور ضرر رساں ہے اس لیے اس کا مٹانا ہی انسانیت کی بہت بڑی خدمت ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نئی نسل نہ صرف ماضی کے ورثے سے اپنے آپ کو یکسر محروم کر لیتی ہے بلکہ اس کی دشمن بن کر اپنے ہاتھوں سے اُسے دریا برد کر دیتی ہے۔ اس نسل کا مستقبل کیا ہو سکتا ہے جو ہزاروں سالوں پر پھیلی ہوئی انسانی کاوشوں سے فائدہ اٹھانے کی بجائے انہیں نیست و نابود کرنے کے درپے ہو جائے اور اس غلط مفروضے پر اپنی جدوجہد کا آغاز کرے کہ اُسے ماضی سے جو کچھ ملا ہے اسے یکسر مٹا کر ہی وہ اپنی تعمیر کر سکتی ہے۔

پھر مغرب کی جارحانہ قوم پرستی نے نفرت کے جو بیج مختلف قوموں کے دلوں میں بوئے تھے خلائے نسل کے نظریے نے وہی بیج ایک ہی قوم کی مختلف نسلوں کے دلوں میں بو دیئے۔ اور اسی طرح ہر قوم کے تاریخی تسلسل کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔